اقبال کا تصورِ انقلابِ اسلامی

ڈاکٹر کلیم صدیقی
ڈائرکٹر مسلم انسٹی ٹیوٹ، لندن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال میرا مرشد ہے۔ ہم اردو داں بڑے خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اقبال جیسا مفکر اور شاعر عطا فرمایا۔ یہ بھی ہماری خوش نصیبی ہے کہ اقبال عرب میں پیدا نہیں ہوا، ورنہ آج کے عرب اقبال کا خدا جانے کیا حشر کرتے جب کہ وہ کلامِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کی عملاً خلاف ورزیوں سے کبھی نہیں چُوکتے۔

لیکن آیئے اقبال کو تاریخی پس منظر میں دیکھیں۔ اقبال ایک ایسے دور میں پیدا ہوا جب کہ مسلمانوں نے غلامی پر رضامندی اختیار کر رکھی تھی۔ اقبال بھی اپنی قوم کی طرح غلام تھا۔ لیکن وہ ایک ایسا غلام تھا جس نے ساری عمر اپنی اور اپنی قوم کی رہائی اور آزادی کی فکر میں صرف کر دی۔ اقبال آنکھ کھولتا ہے تو اسے ایک بہت بڑی چیز نظر آتی ہے اور وہ ہے ہمالہ پہاڑ۔ اقبال اسی پہاڑ سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ آسمان جھک کر ہمالہ کی پیشانی کو چومتا ہے۔ اقبال خود ایک پہاڑ بن جاتا ہے اور قوم کو للکارتا ہے کہ وہ بھی ایک پہاڑ کی طرح اٹل اور آزاد ہو جائے۔

اقبال کے ابتدائی کلام کے متعلق بعض حلقوں کا خیال ہے کہ شروع میں اقبال ہندوستانی قومیت کا نقیب تھا۔ اقبال کی نظمیں ترانۂ ہندی اور ہمالہ کو اس دور کا ترجمان بتایا جاتا ہے۔ یہ خیال میرے نزدیک اقبال کے ساتھ بے انصافی سے کم نہیں 'فصیل کشورِ ہندوستاں' محض ایک جغرافیائی حقیقت بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ جب اقبال ترانۂ ہندی لکھتا ہے تو گنگا سے ایک بدیسی کی حیثیت سے پوچھتا ہے کہ کیا گنگا کو وہ دن یاد ہیں جب وہ کارواں' جس کا اقبال ایک فرد ہے' اس دیس میں اترا تھا؟ ترانۂ ہندی کے آخری شعر میں ایک 'دردِ نہاں' کا تذکرہ بے معنی نہیں۔ یہ وہ درد ہے جس کا کوئی محرم اقبال کو ہندوستان میں نہیں ملتا۔ اور یہ درد ہی اقبال کو ساری زندگی بے چین رکھتا ہے۔

اقبال کا یہ دردِ دل دراصل تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ نے جو رُخ اختیار کیا اقبال اس کی شکایت اپنوں سے' غیروں سے اور خدائے تعالیٰ تک سے بار بار کرتا ہے۔ دورِ اول کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جس کا عنوان 'صدائے درد' ہے۔ اس نظم کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے۔ یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی اقبال کے مذہب میں شروع ہی سے حرام تھی ؎

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجۂ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

اقبال کے ذہن میں تاریخ کا ایک خاکہ ہے۔ اسی خاکے میں شاعر پوری تاریخ کو پرو دیتا ہے۔ اقبال انسان کے اس مقام سے آگاہ ہے جو خالقِ حقیقی نے اسے عطا کیا ہے۔ لیکن اقبال اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ انسان اس مقام سے دُور، بہت دُور چلا گیا ہے۔ اقبال حق اور باطل کی ایک مسلسل جنگ سے آشنا ہے وہ ہم کو بتاتا ہے کہ چراغِ مصطفوی اور شرارِ بُولہبی میں ستیزہ کاری ازل سے تا امروز جاری رہی ہے۔ اقبال جانتا ہے کہ جس دور میں وہ پیدا کیا گیا ہے اس میں بُولہبی کو بالادستی حاصل ہے۔ اس کی تمام کوشش یہ ہے کہ چراغِ مصطفوی کو دوبارہ روشن کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس کی روشنی شرارِ بُولہبی پر غالب آجائے۔

اقبال کے یہاں ایک خوبی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اقبال ہر چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کو اس کی دائمی اور لامحدود سطح پر دیکھتا ہے اور بیان کرتا ہے۔ شمع کو چھوٹا سا طُور کہتا ہے اور پروانے کو ذرہ سا کلیم۔ اگر دہقان کی مثال دیتا ہے تو اسی میں اقبال کو دانہ، کھیتی، باراں سب ہی نظر آجاتے ہیں۔ اگر جستجو کو آوارہ پاتا ہے تو اسی میں راہ، رہرو، رہبر اور منزل سب بیان کرتا ہے۔ اگر طوفان کا سامنا ہے تو وہ یاد دلاتا ہے کہ تو ہی تو ناخدا ہے، بحر ہے، کشتی ہے اور ساحل ہے۔ چاک گریباں دکھلا کر کہتا ہے کہ تو ہی قیس ہے، لیلا ہے، صحرا ہے اور محمل ہے۔ اور جب میں اقبال محتاجِ ساقی پاتا ہے تو برجستہ کہتا ہے: "مے بھی تُو، مینا بھی تُو، ساقی بھی تُو، محفل بھی تُو"

اقبال نے اپنے تیسرے مجموعۂ کلام "ضربِ کلیم" کو دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کہا۔ لیکن اس سے بہت پہلے "بانگِ درا" میں ہی یہ اعلانِ جنگ ہو چکا تھا۔ مثلاً ان دو اشعار میں اقبال ہمیں اسلامی انقلاب کی دعوت دیتا ہے ۔۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو
بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

غور فرمایئے کہ اقبال نے یہ نہیں کہا کہ ایک سیاسی پارٹی بنائی جائے۔ ووٹ حاصل کئے جائیں، اسمبلی کی ممبری کی جائے، اور جمہوریت قائم کی جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم شعلہ بن کر پھونک دیں خاشاکِ غیر اللہ کو۔ غیر اللہ کی نقل میں اقبال ہمیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی" گویا یہ کہ غیر اللہ کی تقلید اور نقل نہ ہمیں زیب دیتی ہے نہ ہی یہ فرمانِ الٰہی ہے۔

گزشتہ پانچ سالوں میں اسلامی انقلاب کی اصطلاح ایران کے انقلاب سے اور بھی زیادہ معروف ہوگئی ہے۔ ایران کے انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کم از کم ایران میں خاشاکِ غیر اللہ کو آگ لگادی اور وہاں کے مسلمانوں کو شعلہ نما حرکت اور اضطراب بخش دیا۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو مسلمانوں میں ناپید ہوگئی تھیں اور ایران کے باہر آج بھی ہر جگہ ناپید ہیں۔

اقبال کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کا سفینۂ برگِ گل موجوں کی کشاکش کے باوجود دریا کے پار ہوگا۔ لیکن سارا قافلہ بیک وقت شاید اُس پار نہ پہنچ سکے تو اقبال کو تلاش ہوئی قافلے کے اُس حصے کی جہاں پہل ہونے کا امکان ہو۔ تو دیکھئے اقبال کی حکیمانہ نظر کہاں پڑتی ہے۔ وہ نشان دہی کرتا ہے کہ: اگر طہران اقوامِ مشرق کا جنیوا (Geneva) بن جائے تو شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آج اقبال زندہ ہوتا تو وہ اسلامی انقلاب ایران کا سب سے

بڑا حامی، نقیب اور مددگار ہوتا ـــــــ وہ خوش ہوتا ـــــــ اس کو ایران کے انقلاب میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب امام خمینی سے یہ پوچھا گیا کہ: کن مفکرین سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؛ تو انہوں نے اقبال لاہوری کا نام سرِ فہرست رکھا۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ اقبال نے ہمارے زمانے کے امام برحق کی سب سے پہلی تعریف یہ بتائی تھی کہ وہ ہمیں حاضر و موجود سے بیزار کر دے گا۔ اور دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمارا امام ہمیں موت کے آئینے میں رُخ دوست دکھا دے، اور ہم شہادت کے لئے بے چین ہو جائیں۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی امامت کی تیسری خصوصیت اقبال یہ بتاتا ہے کہ وہ ہمیں احساس زیاں دلا کر ہمارا لہو گرما دے۔ اور مسلمانوں پر فقر کی سان چڑھا کر انہیں کفر سے نبرد آزما کر دے۔ اور جو قیادت ایسا نہیں کرتی اس کی قیادت کو اقبال فتنۂ ملتِ بیضا کہتا ہے اور ایسی لیڈر شپ مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار کر دیتی ہے۔

میرے نزدیک آج ساری دنیا میں جو مسلمانوں کی قومی مملکتیں۔ (Nation States) وجود میں آگئی ہیں اور جن کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے ساری کی ساری مغرب کی نوآبادیاتی پالیسی کا نتیجہ ہیں اور ہر چھوٹے سے خطّے کو ایک الگ تشخص اور نام اور قومیت دے دی گئی ہے۔ اس طرح اقبال کی زبان میں ہم نے جگہ جگہ اور جدا جدا عہدِ غلامی کر لیا ہے اور ملّتِ احمدِ مرسل کو مقامی کر لیا ہے۔ اور ان قومی ریاستوں کی لیڈر شپ ہر جگہ فتنۂ ملتِ بیضا سے ہرگز کم نہیں۔ ان مقامی نام نہاد لیڈروں نے سیاست میں منافقت اور شرک کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور ہمیں سلاطین اور سُپر پاورز کا پرستار بنا دیا ہے۔ زمانے کی اسی روش کو دیکھ کر

اقبال پر چیخ اٹھتا ہے ؎

آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے!

اقبال سارے جہاں کو صنم کدہ کہتا ہے۔ اس کے نزدیک مقامی قومیتوں کا بُت تراشیدۂ تہذیبِ نَوی ہے اور غارت گرکاشانۂ دینِ نبویؐ ہے۔ اقبال مسلمانوں کو پکارتا ہے، للکارتا ہے اور دعوت دیتا ہے کہ ہم توحید کی قوت کو استعمال کریں۔ ہمارا دیس اسلام ہے اور ہم مصطفوی ہیں اور ہمارا فرض یہ ہے ہم قومیت کے اس بُت کو خاک میں ملا دیں اور ایک نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دیں 'ہمالہ' ہی میں اقبال نے کہہ دیا تھا ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو!

اقبال کے یہاں دو چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک ہے قومیت یا وطنیت' اور دوسری ہے مغرب زدہ طبقے کی لیڈرشپ۔ مغرب زدہ طبقے کی اقبال نے جگہ جگہ خبر لی ہے۔ ان کا مذاق بھی اُڑایا ہے۔ ان کی تعلیم اور تعیش کا مذاق اُڑایا ہے۔ ان کے کلچر کا مذاق اُڑایا ہے۔ ان کی 'ددئی' کا مذاق اُڑایا ہے۔ اور ان کی لیڈرشپ میں مسلمانوں کا جو حشر ہونا تھا وہ اقبال نے توکم' ہم نے' آپ نے زیادہ دیکھا ہے۔ اس طبقے سے متعلق اقبال کا صرف ایک شعر پیشِ خدمت ہے ؎

میں اُن کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں!

دنیائے اسلام میں آج جتنے بھی حکمراں پائے جاتے ہیں اُن سب کی۔ بہی

خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کے گھر کو پھونک کر دنیا کمانے اور نام پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ اقبال جب دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے تو اس کا ہدف نہ صرف مغرب کی تہذیب اور بالادستی ہے بلکہ اقبالؔ کا اعلانِ جنگ اُن لوگوں کے خلاف بھی ہے جو نام نہاد مسلمان تو ہیں لیکن ان کے ہاتھوں مسلم معاشرے کو لادینیت کی طرف تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے۔ اقبالؔ کا انقلاب اسلامی مغرب کے اثرات کو جڑ سمیت اکھاڑ کر باہر پھینک دے گا۔ لیکن ہم کو یہ معلوم ہے اور یہ ہمارا تاریخی مشاہدہ بھی ہے کہ مغرب اپنے مفادات کا ڈٹ کر تحفظ کرتا ہے۔ مغرب نے ہمارے اکثر اور بیشتر حکمرانوں اور مملکتوں کو خرید لیا ہے۔ قوم رسول ہاشمیؐ جب بھی فعال ہو کر ان مغرب زدہ حکمرانوں اور حکومتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گی، یہ داخلی اور بیرونی قوتیں باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے یک جا ہو جائیں گی اور تحریکِ اسلامی کا مقابلہ کریں گی۔

چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی یہ جنگ ازل سے تا امروز جاری رہی ہے اور جاری رہے گی۔ اس جنگ میں شرارِ بولہبی کا ساتھ منافقت نے ہمیشہ دیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج مسلمانوں کی قومی حکومتیں تمام کی تمام منافقت کی آماجگاہ بن چکی ہیں۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ جس انقلاب اسلامی کا نعرہ اقبالؔ نے لگایا تھا اور جس انقلاب اسلامی کا خواب اقبالؔ نے دیکھا اور دکھلایا تھا وہ انقلاب ایران میں برپا ہو کر آج مغرب کی قوت سے نبرد آزما ہے اور اس کے خلاف جنگ کرنے والوں میں عرب قومیت بلکہ عرب منافقت سب سے آگے آگے ہے اور مغرب کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔

اقبالؔ کے یہاں اگر ملتِ بیضا زندہ ہے تو عزبار کے دم سے۔ امرار کو اقبالؔ

دولت کے نشے میں غافل پاتا ہے اس کے نزدیک جو فقر سے میسر ہے تونگری سے نہیں۔ اُمّت کی وحدت پر اقبال بار بار زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جو رنگ و خون کا امتیاز کرے گا مٹ جائے گا۔ اور وہ فرقہ پرستی کو ایک ہنگامۂ محشر قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے ؎

اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش!

اسلام کو اقبال ایک عوامی تحریک (mass movement) قرار دیتا ہے۔ عام حرّیت کا جو خواب اسلام نے دیکھا تھا اسی خواب کو اقبال پھر دہرانا چاہتا ہے۔ جب وہ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر کا خواب دیکھتا ہے تو مغرب کی جادوگری نے جو اُمّت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں ان کو یک لخت ختم اور فنا کر دیتا ہے۔ اقبال صاف کہتا ہے کہ کسی خطۂ ارض کے مسلمان خود اکیلے اپنے مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کے مسائل عالم گیر ہیں اور ان کے پاس ایک عالم گیر دین اور ایمان ہے۔ قرآن ہے، رسول ہے، تاریخ ہے۔ اقبال کے نزدیک عثمانیوں پر کوہِ غم کا ٹوٹنا کوئی غم کی بات نہیں، اس لئے ؏

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

اقبال کے یہاں اخوت کی جہانگیری ملتی ہے اور محبت کی فراوانی۔ یہ وہ نسخہ ہے جس سے ملّت میں پیدا شدہ بُتانِ رنگ و خون ٹوٹ جاتے ہیں اور نہ تورانی نہ ایرانی نہ افغانی باقی رہ جاتے ہیں۔ خدا کے پاک بندوں کی زندہ اقبال نے استغنا بتائی ہے۔ ان کا عمل بے غرض بتایا ہے۔ ان کا فقر قیصر و کسریٰ کو ہلاک کر دیتا ہے ان کی نگاہ شوخ و بے باک ہے۔ اقبال کا مومن فقیری میں بھی شاہی کرتا ہے۔ اقبال کا سپاہی بے تیغ بھی لڑتا ہے۔ بلکہ اقبال کا مومن تو تقدیرِ الٰہی بھی بن جاتا ہے۔

اور جب تک مومن میں دلِ بیدار پیدا نہیں ہوتا اس کی ضرب کاری نہیں ہوتی۔ اقبال کے رندانِ پاکباز ساقیٔ فرنگ سے سوالِ مے نہیں کرتے بلکہ محوِ خود نمائی رہتے ہیں اور تعمیر خودی میں خدائی تلاش کرتے ہیں۔ ایک مسلمان ایک وقت میں یا بندۂ خدا بن سکتا ہے یا بندۂ زمانہ۔ دونوں کی بندگی ممکن نہیں ہے۔ سحرِ فرنگیانہ کے جواب میں اقبال کردارِ قاہرانہ اور جذبِ قلندرانہ پیش کرتا ہے۔ یہ ہیں وہ مردِ حق جن کو اقبال خلیلؑ کا لقب دیتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ دنیا کے اس صنم کدے کو پاش پاش کر دیں۔ جو مغرب کی ساحری اور مغربی تعلیم کے عمارت گروں نے بنایا ہے۔

اقبال کے نزدیک اس زمانے میں سب سے بڑا اسلامی انقلاب یہ ہوگا کہ مسلم ممالک اور معاشروں سے مغرب کے اثرات کو ختم کر دیا جائے، اور مغرب کی سرمایہ داری اور سیاست نے ہمارے اوپر جو بالادستی حاصل کرلی اُس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔

اقبال پیغمبرِ اسلامؐ کا عاشق ہے۔ وہ ہمیں بار بار یاد دلاتا ہے کہ ہم اُس کی اُمت ہیں۔ اقبال کے ذہن میں سُنّتِ محمدیؐ کا ایک انقلابی نقشہ پایا جاتا ہے۔ اقبال پیغمبرِ اسلام کو سالارِ کارواں کے رول میں دیکھتا اور پیش کرتا ہے۔ وطنیت کی سب سے بڑی خامی اس کے نزدیک یہ ہے کہ یہ 'غارت گرِ دینِ نبویؐ ہے'۔ اقبال جب شکوے کے لئے قلم اٹھاتا ہے تو پہلے ہی کہہ دیتا ہے کہ تیرے محبوبؐ کی اُمت دیوانی تو نہ تھی۔ خدائے تعالیٰ سے استفسار کرتا ہے کہ 'تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟' اور جب جوابِ شکوہ میں ہماری خبر لیتا ہے تو ؎

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

اگر اس تاریک دور میں اجالا ممکن ہے تو صرف اسمِ محمدؐ سے اور چراغِ مصطفوی سے ۔ اقبال کبھی شہرِ یثرب کو پیغام بھیجتا ہے کبھی کملی والے کو۔ بلکہ ایک وقت تو خود ہی شام وسحر کے نظام سے نکل کر حضورِ رسالت مآب میں پہنچ جاتا ہے، اور ہمیں بتاتا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

اور جب اقبال اپنی دانش کے افرنگی ہونے کا اور اپنے ایمان کے زناری ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو وہ مولائے یثربؐ کو اپنی چارہ سازی کے لئے بلاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز اقبال کو آنی وفانی نظر آتی ہے۔ لیکن اسے ایک مقام پر رنگِ ثباتِ دوام بھی نظر آتا ہے اور ثبات صرف عشقِ رسولؐ میں ہے ؎

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

اور اقبال کے نزدیک اسی عشق سے نغمۂ حیات ہے، نورِ حیات ہے، اور نارِ حیات ہے۔ اقبال روحِ محمدؐ سے پوچھتا ہے کہ یہ 'آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے'! لیکن غور فرمایئے کہ اقبال انگریز سے کس قدر بدظن ہے ؎

اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰؐ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام!

اور ابلیس جب اپنے مشیروں سے خطاب کرتا ہے تو اسے ڈر صرف یہ ہے کہ 'ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں'۔ شیطان کے نزدیک سب سے بڑا انقلاب جو ہے اسے اقبال یوں بیان کرتا ہے ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

اور آخر میں جوابِ شکوہ کا آخری شعر پیش کرتا ہوں جو میرے نزدیک اقبال کے انقلاب اسلامی کا منشور ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

THE MUSLIM INSTITUTE
6 Endsleigh Street London WC1H ODS

یہ مقالہ اقبال کی برسی کے موقع پر
۲۱ر اپریل ۱۹۸۱ء کو کانوے ہال لندن میں پڑھا گیا۔
یہ جلسہ مجلس اقبال (یو کے) کے زیر اہتمام
منعقد ہوا تھا۔